مشتاق احمد یوسفی

سرخیل قبیلہ یگانہ

(افتخار عارف اور ان کی شاعری)

BCCI نے جن ادیبوں اور شاعروں کو خراب و خوار و مخمل اور خوش حال کیا، ان میں افتخار عارف کا تیسرا نمبر ہے۔ دوسرے نمبر پر محبی و مشفقی جناب الطاف گوہر ہیں جو دوران قیام لندن، اپنے آقائے سابق الانعام فیلڈ مارشل ایوب خاں کے کارناموں کو بزبان انگریزی رقم کر چکے ہیں۔ وہ اردو کے مانے ہوئے ادیب ہونے کے علاوہ عاقل و دور اندیش بھی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کتاب اردو میں اس لئے نہیں لکھی کہ اندیشہ تھا کہ پڑھنے والے سمجھ جائیں گے ...... اور پھر سمجھ لیں گے۔ ایسے نازک موضوعات پر ہاتھ قلم کروائے بغیر نثر میں کچھ لکھنا مصنف کی چالاکی کے علاوہ جلاد کی نالائقی اور فرائض سے غفلت کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اگر خدا نخواستہ ہاتھ قلم ہو جاتے تو پھر ہم جیسے عقیدت مندان قدیم اور افتخار عارف جیسے بیعت کنندگان جدید مرشد کے ہاتھ کی بجائے پیر کو بطور متبادل بوسہ گاہ چومتے۔ مگر وہ غلام اسحاق خاں کے خلاف "مسلم" میں دھنسی اداریئے کیسے لکھتے۔ وہ ہمارے لائق ترین اور واحد بیورو کریٹ ہیں جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے دو presidents کو جو اس کے باس رہ چکے تھے، ٹھکانے لگایا۔ ایک کو مخالفت کر کے اور دوسرے کو حمایت کر کے۔ جو خنجر و شمشیر سے نہ مرا، اسے kiss of death (بوسہ مرگ) سے سلا دیا۔

اب اس مخمل و خوش حال گھرانے کا پہلا نام کیا بتائیں اور کیسے بتائیں۔ زبان پہ آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کسر نفسی "ہیں ہیں!!" کرتی ہوئی منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شہرت عام اور رشک خواص و عوام کا اندیشہ بھی ہے۔ یوں بھی تعلی شاعرانہ کا رواج اب صرف سیاسی تقریروں تک محدود ہے۔ جسے داغ کہتے ہیں دوستو، اسی روسیاہ کا نام ہے۔

اگر آپ اس وقت لحاظ کر کے خاموش بھی رہے تو باہر نکلتے ہی، مجھ سے نہیں تو افتخار عارف سے ضرور پوچھیں گے کہ ان باتوں کا "حرف باریاب" سے کیا تعلق؟ اس تعلق خاص کی وضاحت ذرا آگے چل کر کروں گا۔ پہلے خوشحالی کی اس شاخ ثمردار کی ایک جھلک دکھانے کو جی چاہتا ہے، جس کی باجماعت خوشہ چینی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ BCCI کے دو سینئر افسروں کا انتقال ہوا تو بینک کے سیاہ و سفید و سرمئی کے مالک جناب آغا حسن عابدی نے ان کی بیواؤں کے نام ایک ایک ملین ڈالر کے مکانات منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک ملین ڈالر نقد ادا کئے گئے۔ یعنی ہر دو مدات ملا کر، دونوں کو چھ چھ کروڑ روپے اور ایک ایک مرسڈیز کار ملی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سہاگنیں ان بیواؤں کو رشک کی نگاہ سے اور اپنے زندہ شوہروں کو قہر بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہم دونوں یعنی افتخار عارف اور فقیر شرمندہ شرمندہ سے پھرتے تھے کہ مرنا اگر یہی ہے تو جینا فضول ہے۔ BCCI کے در و دیوار زبان حال سے جان پر کھیلنے کی دعوت دیتے رہے:

اے مرد ناتواں تجھے کیا انتظار ہے؟

صاحبو! بروقت اور منفعت بخش موت ہر کس و ناکس کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ یہ تمہید ہم نے بربنائے تفنن نہیں باندھی۔ BCCI نے بیرون ملک جو وسیلہ روزی و رسوائی فراہم کیا، اس کی سہولتوں اور فراغت فراواں کے طفیل ہمیں تین کتابوں کی سوغات ملی۔ افتخار عارف کی "مہر دو نیم" الطاف گوہر کی "ایوب خاں"۔

اور تیسری کتاب ایک بار پھر افتخار عارف کی "حرف باریاب" جس کا معتد بہ حصہ لندن کے روز و شب کے جلی و خفی حوالوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس مجموعے کے ایک ایسے دلچسپ پہلو کی طرف آپ کی توجہ کرانی چاہوں گا جس کی طرف غالباً ابھی تک کسی کی توجہ نہیں گئی۔ ظاہر بات ہے، ان کی شاعری ان کی واردات قلبی ہے اور کیوں نہ ہو۔ لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ان کے بظاہر عشقیہ اشعار سے بھی BCCI کی تاریخ ولادت و فضیحت و وفات کے مادے نکلتے ہیں۔ ان کی اور عاجز کی آپ بیتی میں اس کی "باپ" بیتی کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ افتخار عارف تیرہ سال BCCI سے متعلق و منسوب اور وظیفہ یاب رہے۔ اس کی داستان لذیذ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس میں کچھ بالانشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ مگر ہم اس کو کسی اور مناسب موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم ایک جملے کے کوزے میں اس بحیرہ تلخاب کو یوں بند کریں گے کہ بینک کو چلانے والوں نے پبلک ڈپازٹ کو منافع سمجھا اور منافع کو اپنا ماہانہ معاوضہ سمجھ کر کھا گئے۔

افتخار عارف کو ایک لحاظ سے BCCI اور اس کے آقایان ولی نعمت اور غزنویان عالی مرتبت کا فردوسی کہا جاسکتا ہے۔ شعر اگر ہمارا وسیلہ اظہار جلال و ملال ہوتا تو ہم بھی اپنے لئے یہی لقب تجویز کرتے۔ فرق اتنا ہے کہ روایت کے مطابق فردوسی نے انتقاماً محمود غزنوی کی ہجو اس وقت کہی جب اسے حسب وعدہ "شاہنامہ" لکھنے کے صلے میں اشرفیاں نہیں ملیں۔ لیکن افتخار عارف اور ہم فردوسی سے زیادہ چالاک نکلے کہ ہم نے شاہ اور اس کے مصاحبوں، حواریوں اور درباری مداریوں کی مدح لکھے بغیر پوری اشرفیاں ماہ بماہ وصول کیں اور ہجو بھی کہی۔ اشرفیاں ہمارا حق محنت تھا..... وہ محنت جو تازہ بتازہ ہجو کہنے میں ماہ بماہ اور سال بسال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی کے گماشتے فردوسی کے گھر اشرفیوں کے توڑے لے کر پہنچے تو اس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ لیکن موجودہ کیس میں جنازہ خود ممدوح کا نکلا۔ اس ضمن میں منتخب اشعار ہم آگے چل کر سنائیں گے۔

افتخار عارف اور ان کی شاعری پر میں تیسری بار مضمون پڑھ رہا ہوں۔ بظاہر اب صرف ایک کی اور گنجائش رہ گئی ہے۔ پرانے دوستوں کے بارے میں ہر بار اور یکجا اور بچی بات کہنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان سے دشمنی ہو جائے۔ میں نے ۱۹۸۳ میں اردو مرکز لندن اور پھر ۱۹۹۲ء میں کراچی جم خانہ میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ پڑھا، اسے ان کے دوستوں نے مدحیہ اور دشمنوں نے مزاحیہ سمجھا اور دونوں خوش خوش گھر لوٹے۔ خود افتخار عارف یہ دیکھ کر محظوظ ہوئے کہ بچھو اپنے پیاروں کو پیار بھی اپنے ڈنک ہی سے کرتا ہے۔

اس دفعہ بھی وقت کی کمی اور اپنے تساہل غیر عارفانہ کے سبب میں جہاں تہاں سے انہی مضامین سے اقتباسات، نئی ترامیم اور تازہ اضافوں کے ساتھ، پیش کروں گا جنہیں آپ اس طرح سماعت فرمائیے جس طرح پرانی گھسی پٹی فلم کے شائقین اس کا نام نہاد نیا پرنٹ دیکھتے ہیں جس میں یہ تک نظر نہیں آتا کہ اسکرین پر جو دو سائے نظر آرہے ہیں ان میں سے ہیروئن کون ہے اور ہیرو کون..... تخیل کی آنکھ پہ حسرت کی عینک لگا کر ان کو یعنی اپنے ہی ماضی کو دیکھتے ہیں۔ جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں۔

سرقے کی بدترین اور سب سے پھوہڑ شکل اپنے ہی فقروں کی تکرار اور اپنی ہی تحریر کی چوری ہے، جو صرف اس صورت میں جائز ہے کہ مصنف کو اللہ کی رحمت اور حاضرین کے حافظے کی کمزوری پر یقین کامل ہو۔ سو اسی اعتراف اور امید کے ساتھ گزارشات نو

میں پرانی تحریر کے پیوند جا بجا لگتے ہیں۔ یہ نہ مقالہ ہے نہ خطبہ عالمانہ، بلکہ سادہ پانی کا وہ گلاس ہے جو ریستوراں میں اچھی چائے سے پیشتر مفت ملتا ہے۔ آپ دو چار گھونٹ لے لیں تو میں خود اسے اٹھا کر علیحدہ رکھ دوں گا۔ پھر بادۂ عارفانہ کا دور چلے گا۔

جب کسی شخص کی دشمنوں کی تعداد میں یکا یک اور بلاوجہ زبردست اضافہ ہو جائے تو جاننا چاہیے کہ اس نے زندگی میں قابل ذکر اور قریبی دوستوں کے لئے ناقابل برداشت ترقی کی ہے۔ یعنی اس کی اپنی تمنا سے کم، مگر حاسدوں کی تاب سے زیادہ۔ جب یہ منزل آجائے تو ترقی کی رفتار کو مخالفین کے رشک و حسد کے درجۂ شدت سے ناپا جا سکتا ہے۔ سو افتخار عارف اس دوست آزما مرحلے سے زخمی مگر سربلند گزرے ہیں۔ انداز ان کا فاتحانہ کم، فدویانہ زیادہ ہے۔ یہ ان کی شائستگی کا تقاضا، منصب کی مجبوری اور طبیعت کا ڈسپلن ہے۔ وہ مشاعروں میں جم کے پڑھتے ہیں اور کسی کو جمنے نہیں دیتے۔ اتنی کم مدت میں اتنی شہرت کمانے کے بعد کوئی شاعر اپنے ہم چشموں کا ہیرو نہیں بن سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انہیں شہرت تو بہت ملی مگر اس کے نتیجے میں ملا کیا؟

اک خلعت دشنام و کلاہ سخن بد

قصور ان کا صرف اتنا ہے کہ اچھا شعر کہتے ہیں اور اس طرح پڑھتے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔ محترمی ظفر صاحب نے کہ آشنائے رموز شعر و شہرت و دشنام ہیں، ایک منہ بولتی ردیف میں کیا حسب حال شعر نکالا ہے:

گمنام جو بھی رہتا ہے، عزت اس کی ہے
مشہور ہوئے گا، تو بہت خوار ہوئے گا

شعر لاجواب ہے، مگر ظفر اقبال کو گمنامی کا ذاتی تجربہ نہیں۔ ہم کہ یکے از انبوہ گمنامان پاکستان ہیں، اپنے تجربے کی بناء پر عرض کریں گے کہ بے عزتی تو گمنامی میں بھی ہوتی ہے، مگر اس طرح جیسے ایک روزہ دار دوسرے روزہ دار کو گالی دے۔

انہیں جو مقام، شہرت اور ستائش بال سفید ہونے سے پہلے ملی، وہ اردو شاعروں کو بالعموم مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

یادش بخیر! تحسین سروری ایک معروف ادیب گزرے ہیں۔ آخری ایام میں مفلسی نے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کچھ اس کا سبب حالات تھے اور کچھ، بلکہ بہت کچھ، وہ خود..... احباب نے مشورہ دیا کہ رائٹرز گلڈ سے رجوع کرو۔ تحسین سروری نے اپنی درخواست میں لکھا کہ رائٹرز گلڈ میری وفات کے بعد، حسب ضابطہ و دستور، میری بیوہ کو ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ دے گی۔ میری استدعا ہے کہ مجھے اس کا نصف یعنی پانچ سو روپے زندگی میں ہی دے دیئے جائیں تا کہ میں مرنے سے اور گلڈ دگنی زیر باری سے بچ جائے۔

افتخار عارف کو بھی حکومت برطانیہ نے قبل از پیری، پنشن کا حقدار تسلیم کر لیا ہے۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ جو لوگ کسی لحاظ سے واجب الاحترام نظر نہیں آتے، انہیں بھی ـــ بلکہ ادبدا کے انہیں کو تعظیم دیتے ہیں جس شخص سے افتخار عارف غیر معمولی تواضع و تکریم سے پیش آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے مافوق الفطرت حد تک نالائق سمجھتے ہیں۔ پہلے پیر چھوا کرتے تھے، اب گھٹنے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ان کی گردن پکڑ سکیں۔ کہتے ہیں:

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب اس کے رفیق
جس کو اصول فرق مراتب آتا ہے

چار عناصر تو ان کے رقیب ہو گئے، مگر ان سب کا مجموعہ شوریدگی.... انسان.... نہ کبھی کسی کا ہوا، نہ ہوگا۔ ہر ایک سے تپاک اور گرم جوشی سے ملنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کے دلوں میں خود کھوٹ ہے ان کو یار کے پیار میں بھی P.R نظر آتا ہے۔ خود کو دنیوی اعتبار سے چوکس اور ہوش مند ثابت کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کی مہر و مروت کو منافقت سے تعبیر کیا جائے۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے بڑا وہ عیار سا

افتخار عارف کے ذوق اور مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ ان کی پسند و ناپسند کی قطعیت اور تنوع سے ہوتا ہے۔ آئیے پہلے ان کی چڑ پر نظر ڈالیں۔ ٹھس آدمی، شعر ناشناس باس، بینکرز، ہر قسم کی دال اور سبزی، صحیح ساخت کی قمیص، بدن کی ہر وہ جنبش اور حرکت جس پر ورزش کا گمان ہو، چھوٹی بحر اور پختہ عمر والوں کی صحبت سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب ذرا ان کی مرغوبات ملاحظہ ہوں: پہلے نمبر پر سیخ کباب، دوسرے نمبر پر شامی کباب، تیسرے نمبر پر بہاری کباب، پھر کسی بھی قسم کا کباب جو دستیاب ہو۔ اس کے بعد بریانی جس میں چاول برائے نام ہوں، تیز مرچیں اور گرم مصالحہ اور اسی خاصیت کے تازہ ترین اسکینڈل۔ ہر قسم کا میٹھا جس میں شکر کے ساتھ کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب شکر خوری

مرزا کہتے ہیں کہ یورو پین "میٹھے" ذیابیطس کے مریضوں نے ایجاد کئے تھے۔ سیاہ رنگ بھی پسند ہے بشرطیکہ غلط جگہ نہ لگا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ چہرے پر نہ ہو۔ کتاب سے عشق ہے۔ چنانچہ وہ چہرے بھی پسند ہیں جو اس سے مشابہت رکھتے ہوں۔ یعنی کتابی ہوں:

کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کے برعکس مرزا کو کتابی چہرے سے چڑ ہے، مگر اشکچوپیل خاتون کو قدر دشیفتگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بشرطیکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہو۔ تین "خ" کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ Triple "خ" مختلف سے مراد ہیں: خوبصورت خواتین کے خاوند۔ واضح رہے کہ یہ بات ہم نے مرزا کے بارے میں کہی ہے اور صرف یہ دکھانے کے لئے کہ چڑ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوا کرتی۔ افتخار عارف کو رات گئے تک گپ، بند گلے کا سفید کوٹ، سرخ موزے، جوانی کے مجروح جذبات سے میچ کرتی ہوئی ٹائی، یعنی لہو لہان لال۔ زردی مائل سلک کی قمیص انہیں بھاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے خوب پھبتی ہے۔

زرد رنگ پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی جمالیاتی ترجیحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں بسنتی رنگ، گدرایا ہوا سڈول پن، چکنی جلد اور گداز contours بہت پسند ہیں۔ اس پر مرزا عبدالودود بیگ بولے کہ یہ پانچوں خوبیاں "بدرجہ اتم" کراچی کے پپیتے میں پائی جاتی ہیں۔

کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور کون سی بری، اس کی وضاحت، مولانا حالی کی طرح، بعض شاعر اپنے مقدمے میں کر دیتے ہیں اور بعض اپنے ہی اشعار سے یہ فرق ذہن نشین کروا دیتے ہیں۔ افتخار عارف نے نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا، نہ ہماری طرح اپنا مقدمہ آپ لکھا کہ دوسرے تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "مہر دو نیم" کی ابتداء دو معرکۃ الآرا مقدموں سے ہوتی ہے۔ پہلے مقدمے میں فیض نے ان کی انفرادیت، آہنگ و عروض، لغت اور محاورے میں اجتہاد، ظلم و تعدی، جبر و زباں بندی کے خلاف احتجاج اور رزق کے اسیروں کی محتاجی اور تذلیل پر بڑے جامع اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اس مختصر مگر خوبصورت مقدمے کے ہوتے ہوئے، مخدومی محبی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے عالمانہ اور بھاری بھر کم مضمون کی، بحیثیت مقدمہ ثانی، چنداں ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ بعض ادبی حلقوں میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حلقوں کو دونوں ممتاز بزرگوں کی حقنۂ تعریف نے بے مزہ کیا۔ لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ افتخار عارف اپنی وضع احتیاط اور رکھ رکھاؤ کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں، بالخصوص نئی نویلی دلہن، ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جاتیں تو رستے میں کہاروں کو کندھا نہیں بدلنے

دیتی تھیں اور روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوادیتی تھیں تاکہ کہاروں کو اصل وزن کا اندازہ نہ ہوسکے۔ بعض کمزور دل والے فقط وزن پر ہی عاشق ہو جایا کرتے تھے۔ موصوف گرامی قدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری پتھر ہے جو چوم چوم کر چھوڑنے کی بجائے ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہماشا کی نظر بد سے بچاتا ہے۔

یہ ڈولی میں پتھر والی بات جب لندن سے سینہ اور حسینہ بہ حسینہ دلی پہنچی تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بہت برا مانا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ ایسی شاعری کسی سرٹیفکیٹ کی محتاج نہیں۔ عزیزم افتخار نے منہ سے تو کچھ نہ کہا کہ وہ ہماری محبت، خلوص نیت اور بھولپن پر یقین کامل رکھتے ہیں، مگر اس واقعے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہم کوئی مضمون پڑھ رہے ہیں تو ایسی گونگی تالی بجانے لگے جس میں دونوں ہاتھ تو ملتے ہیں، آواز بالکل نہیں نکلتی۔ آج صبح ہم نے برادرم مشفق خواجہ سے اپنی الجھن اور دونوں عزیز دوستوں کی آزردگی کا ذکر مشورۃً کیا تو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میں اب ڈولی سے یہ پتھر اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک تم کسی دوسرے پردہ نشین کی ڈولی کا پتہ فراہم نہ کرو جس میں یہ پتھر رکھ سکوں۔

لندن کی اس خوبصورت اور یادگار تقریب میں میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے کبھی شعر نہیں کہا، اور از بسکہ میرے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں، اس لئے آئندہ شعر کہنے کا کوئی احتمال بھی نہیں۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کرسکوں۔ نہ میری صحت اس کی اجازت دیتی کہ میں کسی بھی برے شاعر کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرسکوں۔ غالباً کیا، یقیناً، ان ہی خامیوں کی بنا پر آپ نے مجھے اظہار رائے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس دن یہ بھی عرض کیا تھا کہ دراصل مجھ جیسے نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں جاکر شیر کو vegetarianism کے فوائد و فضائل پر لکچر دے۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں افتخار عارف ہی سے رجوع کرنا چاہئے کہ وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر اور شاعر کے پارکھ بھی ہیں۔ وہ خراب شعر، نیم گرم دوستی، صحیح سائز کی قمیض اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کرسکتے۔ خراب شعر، نثری نظم اور بے رس نثر لکھنے والوں کے بارے میں ایک زمانے میں افتخار عارف کا عقیدہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے۔ یہ بھی پرانی تہذیب کی شائستگی، اور موجودہ کلچر کی مجبوری ہے کہ بد کو جس نے خلق خدا کی زندگی عذاب کردی ہے، کبھی زندگی میں روکتے تھے نہ ٹوکتے تھے۔ اس کے غسل میت اور تجہیز و تکفین کے بعد اس کا جنازہ سامنے رکھا جاتا اور لوگ ہر طرح سے اطمینان کرلیتے کہ اب یہ اٹھ کر ذلیل نہیں کرسکتا تو پہلی بار اس کے بارے میں سچ بولتے تھے، اور نماز جنازہ حرام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ پہلے ہم موت سے نہیں ڈرتے تھے، مگر اب ہمیں محض افتخار عارف کے فتوے کی وجہ سے موت سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اس لئے کہ پشتو محاورے کے مطابق ہم اپنا مردہ خراب نہیں کروانا چاہتے۔

اس زمانے میں خراب شاعر کے لئے افتخار عارف نے ایک اصطلاح وضع کر رکھی تھی۔ بکری شاعر۔ شعر و شاعری سے بیزاری کی وجہ تو ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن بکری میں ہمیں پہلی نظر میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ افتخار عارف اس کے کباب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ داد افتخار عارف خراب شعر کی بھی دیتے ہیں کہ یہ ان کی شائستگی اور آداب سماعت کا تقاضا ہے۔ مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ اچھے شعر پر سینہ پہ ہاتھ رکھ کر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے ہیں۔ برا شعر سنتے وقت ان کے منہ سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکلتی ہیں جو داد سے مشابہ ضرور ہوتی ہیں، مگر ڈکشنری میں نہیں ملتیں۔ لگاتار خراب شعر سننے پڑیں تو وہ سر پیٹنے کی بجائے دائیں ہاتھ سے بار بار اپنا زانو پیٹتے ہیں۔ اگر شعر بہت ہی خراب ہو تو اٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں شاعر کے گھٹنے پکڑ لیتے ہیں جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کہیں وہ شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور یہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں۔

افتخار عارف ایک لطیفہ ایک ذہین اور منہ پھٹ شاعر کے حوالے سے سناتے ہیں۔ اس نے ایک شاعر سے جو دس سال سے بڑی لگن اور مستقل مزاجی سے شعر کہہ رہے تھے، پوچھا، کیا آپ کو کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ میں بھی اچھے شعر کہہ سکتا۔ ☆☆ (باقی آئندہ شمارہ میں)

مشتاق احمد یوسفی

سرخیل قبیلہ یگانہ

(افتخار عارف اور ان کی شاعری)

(دوسری قسط)

افتخار عارف لندن میں کوئی چودہ سال مشاعرے لوٹتے رہے۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں بھی برابر شب‌خون مارتے رہے۔ لندن میں ہم نے ان کی پذیرائی اور مقبولیت کا یہ عالم دیدہ رشک و حیرت سے دیکھا کہ جب ان کے اہل خانہ و خاندان لندن میں نہیں ہوتے تھے تو روزانہ ان کے فلیٹ کے دروازے پر کوئی فین، ٹفن کیریر یا Plastic Container میں تازہ کھانا رکھ جاتا تھا۔ کبھی ایک سے زیادہ گھر سے آیا ہوا ڈبہ بھی دیکھا گیا۔ یہ غیبی سلسلہ مہینوں جاری رہتا۔ یہ تو ہم نے سن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ کی ناشکری امت پر آسمان سے من و سلویٰ اترا کرتا تھا، اور یہ بھی سنا تھا کہ اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ لیکن یہاں تو شکر، مع شکر دانی نازل ہو رہی تھی! ایک دفعہ ہم بھی تنہائی اور غذائی قلت کا شکار ہوئے تو ایک بھرا ہوا ٹفن کیریر سرخ ربن اور Scented پرچی سمیت، جو ان کی دہلیز پر رکھا تھا، چپ چپاتے اٹھا لائے کہ بھوک اور دوستی میں خیانت محرمانہ جائز ہے۔ کیا عرض کریں، ہر خانے میں ایک لذیذ ڈش اور ہر ڈش سے کھانے کی خوشبو کے علاوہ بوئے وفا کی لپٹیں بکثرت آئیں۔ شعر کی داد، نرگسی کوفتے اور شاہی ٹکڑے سے ملتی ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ہم لکھنے کے باب میں نہایت کاہل اور سست رفتار واقع ہوئے ہیں۔ بارہ سال بعد ہماری ایک کتاب آئی ہے لیکن ہماری نثر کی تعریف میں اگر کوئی ہمیں اردو کی دال سے بھی نواز دے تو ہم روزانہ لکھنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا مطلب شکریے کا خط لکھنے سے ہے۔ اس پر یاد آیا کہ دال نہ صرف یہ کہ افتخار عارف کبھی نہیں کھاتے، گھر میں پکنے بھی نہیں دیتے کہ بگھار کی بو سے شعر کا نزول بند ہو جاتا ہے۔ سبزی کو صرف بہار اور چوپایوں کا حق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں خود کو بارہواں کھلاڑی کہا ہے جو اس انتظار میں بیٹھا گیندیں گنتا رہتا ہے کہ کوئی کھلاڑی زخمی ہو تو اس کے عوض اسے بھی کھیلنے کا چانس ملے۔ یہ بھی ان کی کسر نفسی ہے۔ ہمیں تو وہ کسی طرف سے بارہویں کھلاڑی نظر نہیں آتے۔ ہر لحاظ سے جاوید میاں داد ہیں۔

ایک اور سیاق و سباق میں، حریف حرف بازیاب کو متوجہ کرتے ہیں:

مرے مہربان! کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھئے۔ ہم انہیں ان کی پسند کے عروضی اور معنوی رشتے جوڑنے سے منع نہیں کرتے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اچھے شاعر کا سلسلہ خود اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ افتخار عارف اپنے منفرد ڈکشن اور لہجے کی بنا پر اسی قبیلہ خود فگن و خود نسبتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ امر ان کے لیے باعث فخر ہونا چاہیے کہ وہ بے استادے، بے پیرے اور ادبی اعتبار سے غیر مقلد ہیں۔ غالب نے ایک خط میں مکتوب الیہ کے کلام کی اصلاح کرنے سے معذرت کرتے ہوئے بڑی خوبصورت تاویل پیش کی تھی۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضعیف ہو گیا ہوں۔ ہاتھوں میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی دم نہیں رہا۔ تم بھی اصلاح کے محتاج نہیں رہے۔ لکھتے ہیں:

• شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئینِ شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانتِ شیر، شکار کیا کرتا ہے۔

اسی استعارے کو جاری رکھتے ہوئے عرض پرداز ہوں کہ افتخار عارف جوان ہونے سے پہلے ہی شکار کھیلنے لگے تھے اور شکار بھی بے اعانتِ شیر۔ بے اعانتِ شیر اس لیے کہ خود شیروں کا شکار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اب انہی کی کھال پہ بیٹھ کے فکرِ سخن، یادِ خدا اور ذکرِ بتاں کرتے ہیں۔

رہا اس سلسلے کی آبرو سلامت رہنے اور رکھنے کا سوال، تو اس میں کلام نہیں کہ افتخار اپنے سلسلہ عارفانہ اور منفرد طرزِ تغزل کی آبرو ہیں۔ اور اس آبرو کو بچانے کی خاطر ہی وہ ایک ہاتھ سے اپنی دستار تھامے رہتے ہیں اور دوسرے سے دشمن کا گھٹنا سہلاتے ہیں۔ اگر تیسرا ہاتھ ہوتا تو اس سے بھی ضرور کچھ کام لیتے۔

افتخار عارف، اپنے فن کے آداب اور ہنر کے ڈسپلن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ بے اختیار آہ کو آمد اور ریاض کو آورد نہیں سمجھتے۔ جذباتی اعتبار سے بھی انہوں نے کچھ منزلیں طے اور معرکے سر کیے ہیں۔ کوئز پروگرام "کسوٹی" والا جوان جو اپنی معلوماتِ عامہ اور کتابی علم کی مار سے بڑے بڑوں کو چت کر دیتا تھا اور بیس سوالوں میں شخصیت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیتا تھا، اب سیانا ہو کر خود بڑے بڑے سوال اٹھانے لگا ہے۔ وہ اکہرے بدن والا سانولا سلونا جوان جو اپنی پیشانی پر بڑی محنت سے بکھیرے ہوئے بالوں کو بار بار گردن کے جھٹکے سے بظاہر درست، مگر فی الحقیقت مزید بکھیرتا چلا جاتا تھا وہ ہمیں اس لیے اور بھی یاد ہے کہ ہمارے سر پر اس زمانے میں بھی فالتو بکھیرنے کے لیے تو بہت بعد کی بات ہے، کنگھا تک کرنے کے لیے بال نہیں تھے۔ اب اس جوان کے بال زندگی کی دھوپ میں سفید ہو چکے ہیں۔

میں نے کہیں اور عرض کیا ہے کہ افتخار عارف کے پہلے مجموعے "مہرِ دو نیم" اور "حرفِ باریاب" کے درمیان دس سال، ایک برِ اعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، چند چاند چہرے، ایک خوابِ نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں انہیں دنیا کا سب سے لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ یعنی حصارِ ذات سے نکل کر زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور جو کچھ دیکھا ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی سعیِ مسلسل جو فنی اظہار و ابلاغ کی اصل غایت ہے۔ اس سفر نے ان کے لہجے کو نئی تاب و توانائی بخشی ہے۔ وہ اپنی بات جم کے کہتے ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ کہیں کہیں طیش و ملال سے آواز بھر آتی ہے، مگر اس کی گونج اور گمک نہیں جاتی۔ عجز کا اظہار بھی کرتے ہیں تو اپنی کلاہ کو کج ہی رہنے دیتے ہیں۔ مزاجاً ان کا ادبی رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ عزتِ نفس اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاجی ہے۔ ان کے ہاں صرف تراکیب اور ڈکشن کا شکوہ ہی نہیں بلکہ کا شکوہ اور ایک شائستہ فنی شعلگی اور ہمہمہ بھی ہے۔ ان کا لہجہ ان کے حرف کا اعتبار اور سمپورن ٹھاٹ ہے۔ جب لفظ اپنی چھب دکھا کر اپنا جانا بہچانا مفہوم بیان کرنے کے بعد ہاتھ باندھے چپ کھڑے ہو جاتے ہیں، تب لہجہ بولنے لگتا ہے۔ پھر اس کے اتار چڑھاؤ، گونج گرج اور دھیمے ٹھاٹ اور گندھار سے معانی اور اشارت کے نئے سوتے اور نئی دھنیں دھارائیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ پھر شاعر اپنے باغِ معانی کی بہار دکھاتا ہے۔

شعر ملاحظہ ہوں:

جو ہوا کے رخ پہ کھلے ہوئے ہیں، وہ بادباں تو نظر میں ہیں
وہ جو موجِ خوں سے الجھ رہا ہے، وہ حوصلہ بھی تو دیکھئے

یہ گلو گرفتہ و بستہ رسن جدا مرے ہم قلم
کبھی جابروں کے دلوں میں خوف مکالمہ بھی تو دیکھئے

صاحبو! یہ افتخار عارف ہی کا ہنر اور حوصلہ ہے کہ اتنی احتیاطیں لگانے کے باوجود بیس بیس ہزار سامعین والے مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔ "مہر دو نیم" والا ناسٹلجیا جو انہیں ہر تیسری غزل اور نظم میں رہ رہ کر ستاتا تھا، اب سال بسال، کوچہ بکوچہ، چہرہ بہ چہرہ، یار بہ یار اور یاد بہ یاد کم ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے کرب حال اور فرحت امروز کو جگہ دے رہا ہے۔ ہجر و فراق کے میٹھے میٹھے درد اور احساس محرومی و خود رحمی کی جگہ اب وہ کھل کر سرشاری شب گزشتہ اور نشاط وصل کی بات کرتے ہیں:

وہ بدن کہ بوسہ آتشیں میں جلا بھی پھر بھی ہرا رہا
وہ بدن کہ لمس کی بارشوں میں دھلا بھی پھر بھی نیا رہا
وہ بدن کہ وصل کے فاصلے پہ رہا بھی پھر بھی سرا رہا

ہمارے ہاں جسم کوئی تقدس نہیں رکھتا۔ بدن کے شور انگیز تقاضوں کو غیر شاعرانہ، اسفل اور ناپاک سمجھا جاتا رہا ہے۔ وصل کے خیال سے معشوق کو اتنی خفت نہیں ہوتی جتنی کہ خود عاشق صادق کو۔ اس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً خوف الٰہی و اہلیہ، شدت شرافت بہ سبب غلبہ پیری و ضرورت شری۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی موت اور محبوبہ سے ملاپ کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ وصال!

افتخار عارف آج سے سترہ برس قبل جب لندن وارد ہوئے تو ان کی بیاض میں ایسے مچلتے بلکتے شعر بھی تھے:

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان! بہت شرمندہ ہیں

یہ Adolescent شعر سمجھ دار مردوں اور ناسمجھ خواتین میں بہت "ہٹ" دے گا۔ رہی شرمندہ ہونے کی بات، سو لندن کا ایک سفر اس شرمندگی کو دور کر دیتا ہے ہم جیسے سادہ دل ادیبوں اور افتخار جیسے شاعروں کے عالم حیرت کا اندازہ کیجئے جب وہ پہلے پہل ایسا نظارہ دیکھتے ہیں جو عزائم کی بجائے:

جرائم کو سینے میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

دو سفر اور ایک سفرنامے کے بعد تو قلب ایسا گداز ہو جاتا ہے کہ پھر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

میموں کو شکایت ہے، کم آمیز ہے مومن

لیکن ملاحظہ کیجئے، یہی شاعر پندرہ برس بعد کیسے نازک مرحلے سے کس فنکارانہ ضبط سے گزر جاتا ہے:

مرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

یہ شعر صرف وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو اس مرحلے سے گزرا ہو اور اس کی داد بھی وہی "سسی بے خبرے" والا دے گا جس کا شہر بھنبھور لٹ چکا ہو۔

ان کے ہاں سیاسی واقعات و حوادث پر بھی گہرا احتجاج اور اداس کر دینے والا کمنٹ ملتا ہے:

وہی ہے خواب جسے مل کے سب نے دیکھا تھا
اب اپنے اپنے قبیلوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں

اس پر مرزا عبدالودود بیگ کا کمنٹ بھی سن لیجیے۔ کہتے ہیں ملک کی تعمیر و ترقی کے کام کے لیے بڑی محنت اور لیاقت درکار ہے۔ ملک بنانا اور اسے مضبوط کرنا تو بہت بڑی بات ہے، ہمارے بعض سیاست داں تو اتنے نالائق ہیں کہ ملک توڑ بھی نہیں سکتے جس کی وہ برسوں سے برابر کوشش کر رہے ہیں۔

افتخار عارف کا ذکر ہمارے یار طرح دار اور البیلے شاعر ساقی فاروقی کو درمیان میں لائے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان کے مناقشے کا شمار اردو ادب کے تاریخی معرکوں مثلاً انشاء و مصحفی، نیاز مندان لاہور اور دہلوی گروپ، جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی میں ہونا چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معرکہ یک طرفہ تھا۔ افتخار عارف شاعری میں مزاحمتی انداز اور رجزیہ لہجہ اختیار کر لیتے ہیں، لیکن مزاج ان کا جنگجویانہ نہیں ہے، جب کہ ساقی فاروقی اپنے آپ سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں۔ خود کو کئی بار دنداں شکن شکست دے چکے ہیں۔ بطور تعارف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ساقی اردو کے ایک نہایت خوبصورت، معدودجہ اور یکجنل اور غالباً سب سے بڑے جلالی شاعر ہیں۔ غالباً کی پخ اس لیے لگانی پڑی کہ ہم نے کسی اور جلالی شاعر سے مات اور مار نہیں کھائی۔ پچیس تیس برس سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرپیکار ہیں۔ جس کو دوست رکھتے ہیں، اسے پھر کہیں کا نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ پھر ان کے لائق بھی نہیں رہتا۔ جدید مغربی شاعری اور ادبی رجحانات سے جو براہ راست واقفیت ساقی رکھتے ہیں وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ خالص اور تازہ ترین مغربی Contemporary Diction کے اگر وہ تنہا شاعر نہیں تو سب سے ممتاز شاعر ضرور ہیں۔

ساقی اپنی آسٹرین بیگم کو پیار میں گنڈی اور Rottweiler کتے کو کامریڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ کتا تو اپنے نام اور ساقی کے پیار کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ مینڈک، کتے، بلی، خرگوش، مکڑے، بلے وغیرہ پر بہت خوبصورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی روح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں رہے ہیں۔ جس دن وہ ہم پر مہربان ہوئے ہیں، انھوں نے زمین پر قدم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا ہر قدم ہماری دستار فضیلت پر پڑتا ہے۔ نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی، کلیشے، خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن دوستوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں ان کو خطوں میں القاب کے بجائے گالیاں لکھتے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہم ان سڑی گالیوں کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ ساقی اگر شریفانہ لہجے میں گفتگو کریں تو دونوں ہی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ محبی و مشفقی اسد محمد خاں صاحب نے ساقی کے نام اپنے خط میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں شکایتاً لکھا کہ سور! تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں کیوں نہیں لکھیں! اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ساقی سور پر ایک نظم لکھ رہے تھے جو شائع ہو چکی ہے۔

اب ذرا شعر دیکھیے اور شاعر کے تیور دیکھیے:

سفر میں رکھ، مجھے میری جدائیوں سے پرکھ
فراق دے، مجھے خاک وصال میں نہ ملا

مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں
ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

جو شخص ایسا شعر کہہ سکتا ہے اس پر سات خون معاف ہیں۔ اس سے ہماری مراد سات خودکشیاں ہیں کہ اس غضب کے اور غضب ناک شعر کے ہاتھ اپنے ہی جیتے جیتے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔

جو سات برس پہلے تک گلے میں چھوٹے بڑے، رنگ برنگے موتیوں اور منکوں کی مالا پہن کر ساقی گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھتے تو لوگ شاعری سے چکا چوند ہو کر موتی گننے لگتے۔

حسن شعر خوانی میں جب جلالی لہجے اور اعلیٰ درجے کے اسکاچ وہسکی کی ملاوٹ ہو جائے تو شعر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ پرصعت اس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش، کیڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے ہیں تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ڈرامائی طرز ایجاد کی ہے جس میں اپنے تمام اعضاء استعمال کر کے سننے والے کے پانچوں حواس پر چھا جاتے ہیں۔ جیسے ڈوب کے شعر کہتے ہیں، اسی طرح ڈوب کر پڑھتے ہیں، اور بعض اوقات اتنی گہرائی یعنی شاعر ڈباؤ گہرائی میں اتر جاتے ہیں کہ خود تو نکل آتے ہیں مگر ہم جیسے مداحوں کو یہ کہہ کر وہیں چھوڑ آتے ہیں کہ برادر عزیز! جہاں بھی رہو، خوش رہو!۔

تو یہ ہیں ہمارے یار طرح دار ساقی فاروقی جن کی سرد جنگ افتخار عارف سے کوئی دس برس سے چلی آتی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا جی میں آئی کہ اپنے دوست یعنی افتخار عارف کو ایک ۳۶ صفحوں کا خط لکھ مارا جس میں ان کی سینہ بشری کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوائیں اور اس فرد جرم کی ڈیڑھ دو سو کاپیاں انگلستان، پاکستان اور ہندوستان احباب کو ارسال کر دیں۔ اگر ۳۶ صفحوں کے خط میں آپ ایک خطائی صفر بھی فرض کر لیں تو ہم جیسا تجربہ کار بینکر بھی انگلیوں پر حساب لگا کے بتا سکتا ہے کہ کتنی خطائیں ہوئیں۔

خط اتنا پر تاثیر تھا کہ جس نے پڑھا یہ جانا کہ یہ خرابی تو مجھ میں بھی ہے۔ بعضوں نے عزیز افتخار عارف کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھا کہ فلاں گناہ ہم سے کیوں نہ سرزد ہوا۔ سب لذائذ عزیزم ہی کے حصے میں کیوں آ گئے۔ افتخار عارف نے جواباً اپنے حریف پر حملہ نہیں کیا۔ نہ الزامات کی تردید کی۔ نہ کوئی بیان اپنی صفائی میں دیا۔ وہ اب بھی ساقی سے ملتے اور انہیں ساقی بھائی کہتے ہیں۔ البتہ پھبتیوں کا تبادلہ ہم جیسے مشترک و مخلص دوستوں کے توسط سے ہوتا رہتا ہے۔ کبھی جنگ بندی ہو بھی جاتی ہے تو یار لوگ اپنی طرف سے پھبتیاں گھڑ کے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دیتے ہیں۔ یہ واقعہ ہم نے ذرا مفصل تعارف و پس منظر کے ساتھ اس لیے نقل کیا کہ اس سے افتخار عارف کے مزاج و ردعمل اور رکھ رکھاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔

ان کے بعض اشعار کی شان نزول خود نوشت کا پتہ دیتی ہے۔ عشقیہ اشعار کی شرح وہ خود کریں کہ اپنی واردات قلبی میں وہ بزرگوں کی شرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سردست بی سی سی آئی ..... باعث رسوائی ..... سے سروکار ہے۔ افتخار عارف کے ذاتی تعلقات بینک کے ارباب حل و عقد سے ہمیشہ مخلصانہ و برادرانہ رہے لیکن ان کے متکبرانہ انداز اور ادارے کے خوشامدانہ اور تملق ساز ماحول سے وہ ہمیشہ بیزار اور شاکی ہی نظر آئے۔ لندن کے ابتدائی دور کا ایک شعر ہے جو افتخار سلمہ نے بڑی جرات سے ان کی موجودگی میں بھی سنایا جن کے بارے میں کہا تھا:

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے، یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

پھر رفتہ رفتہ وہ اس ماحول کو گوارا کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ دل گرفتہ نظر آتے ہیں، مگر گلو گرفتہ نہیں۔ لیکن اب حکایت اپنے

آپ سے ہے:

ہوس لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

اب انہیں یہ ملال ہے کہ:

آسودہ رہنے کی خواہش مار گئی ورنہ
آگے، اور بہت آگے تک جا سکتا تھا میں

ان کی انا کو اس ملازمت سے زبردست دھچکا لگا:

بیچ آئے سر قریۂ زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

البتہ دوسرے مصرعے سے ہمیں اتفاق نہیں۔ حق کا اعلان لازم ہے۔ بی سی سی آئی نے سب کو، جن میں خاکسار بھی شامل ہے، دام جو مناسب تھے، ان سے بھی زیادہ دیئے۔ اور فارن ایکسچینج میں دیئے۔ بی سی سی آئی نے اپنے نمک خواران قدیم کی انا کا جنازہ ہمیشہ انہی کی بہت بڑی مرسیڈیز پر نکالا اور مرحومین کو ان کی گوری سکریٹریوں نے بچشم بے اشک قبر میں اتارا۔ عجب آزاد مرد تھے۔ حق شاید ان کی مغفرت کردے۔ پاکستان اور پاکستانی کبھی معاف نہیں کریں گے۔

لندن کے تیسرے اور آخری دور میں "نان و نمک و وعدہ دیوار تحفظ" کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ کھوکھلی دیوار زر اپنے زیر سایہ پناہ گزینوں پر گرتی ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن گرنا تھا۔ لیکن وہ مرثیہ نہیں لکھتے۔ ایک حقارت کے ساتھ وقائع نویسی کرتے ہیں:

قیمت خلعت زر برسر بازار گری
جس کے ہر پیچ میں نخوت تھی وہ دستار گری

کوئی دو برس قبل جب ہم بی سی سی آئی سے رخصت ہوئے تو انہوں نے یہ شعر پہلے پہل سنایا تھا:

ایک درویش خوش اقبال کے جانے کی تھی دیر
پھر تو وہ دھوپ کا بوجھ آیا کہ دیوار گری

پھر تو یہ احوال ہوا کہ بی سی سی آئی سے جو بھی گناہ کار نکالا گیا، اس نے یہی سمجھا کہ وہ درویش میں ہی ہوں۔
اور بھی بہت سے اشعار جو میں اس لیے نہیں پڑھوں گا کہ افتخار عارف کی آواز اور لہجہ کہاں سے لاؤں۔

ان کا مزاج کلاسیکی اور ڈکشن جدید ہے۔ المیہ کربلا اور اس سے متعلق امیجری کو انہوں نے بڑی پرکاری، توانائی اور تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مزاجاً وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ یہی روایت اور اس سے وابستہ تلمیحات اور تمثیل کاری ان کے شعر کی زر تار بنت میں بار بار ابھرتی ہیں۔ وہ جب عمرے پر جانے لگے تو ہم نے انہیں دو نصیحتیں کی تھیں جن پر انہوں نے عمل بھی کیا۔ اول یہ کہ جس دوست یا واقف کار کا نام عمرے کی عبادات و مناسک کے دوران میں اتفاقاً بھی یاد آجائے اس کے حق میں دعائے خیر ضرور کرنا۔ انہوں نے پختہ عہد کیا۔ ان کا بیان ہے کہ خانہ کعبہ کے ملتزم پر وہ گریہ و زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک دو ایسے شاعروں کے نام یاد آگئے جن سے ان کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ ایک دوسرے کا مسرخ اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ افتخار یہ بھی فیصلہ نہیں

کر سکتے تھے کہ ان حضرات کا کلام زیادہ خراب ہے یا کردار۔ اتفاق سے وہ دونوں شاعر ان دنوں بیمار تھے۔ جیسے ہی ان کے نام ذہن میں آئے، ہم لرز گئے۔ قدرے تامل کیا۔ پھر دعا مانگی کہ بار الٰہا! تو ان کی صحت تو بہتر کر دے، مگر کلام کو ویسا ہی رہنے دے۔

دوسری نصیحت ہم نے یہ کی تھی کہ عزیزم! جب بھی عمرے پر جاؤ کم از کم ایک گناہ سے توبہ کرو اور توبہ پر سختی سے عامل رہو۔ ایک گناہ سے تائب ہو کر پہلے عمرے سے بہت خوش خوش لوٹے۔ لیکن دوسرے عمرے کے بعد کچھ بجھے بجھے۔ حسرت زدہ اور ہم سے شاکی سے لگے۔ اللہ جانے گناہ پہلے ختم ہوئے یا قارن! ایکسچینج۔ تیسری مرتبہ عمرے پر نہیں گئے۔ کہتے ہیں ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ ☆

(یہ مضمون "حرف باریاب" کی رسم اجراء میں شیرٹن میں، مئی ۱۹۹۴ء کو بحیثیت مہمان خصوصی پڑھا گیا تھا۔) (چیدہ چیدہ حصے)۔

اردو یونیورسٹی کے گریجویشن کورسوں کے لیے

داخلہ فارم دستیاب

حیدر آباد۔ ۶۔ جون۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے گریجویشن کورسز بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے سبھی طلباء طالبات کے لیے سال اول کا کورس مشترک ہے جو فاؤنڈیشن کورس کہلاتا ہے۔ یہ چار مضامین سائنس و ٹکنالوجی، سوشیل اسٹڈیز، انگریزی اور اردو پر مشتمل ہے۔ سال دوم سے طلباء اپنی مرضی کے مطابق Optional Subjects کا انتخاب کر کے بی اے، بی ایس سی یا بی کام کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ بی اے سال دوم میں چھ اختیاری مضامین میں سے تین کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جب کہ بی کام سال دوم میں سبھی چھ مضامین لازمی ہیں۔ بی ایس سی سال دوم میں تین تین مضامین پر مشتمل اختیاری مضامین کے دو گروپ ہیں جن میں سے طلبہ کو کوئی ایک منتخب کرنا ہے۔ واضح رہے کہ بی ایس سی میں داخلہ صرف انہیں اسٹڈی سنٹر کے طلبا کو دیا جاتا ہے جن سنٹروں پر بی ایس سی کی سہولت حاصل ہے۔

دریں اثنا اردو یونیورسٹی کے تین ڈگری اور چار سرٹی فکیٹ کورسوں میں داخلے کی کارروائی جاری ہے۔ داخلہ فارم یونیورسٹی ہیڈکوارٹر واقع ٹولی چوکی، حیدر آباد کے علاوہ ملک کی بارہ ریاستوں میں قائم یونیورسٹی کے 47 اسٹڈی سنٹروں پر دستیاب ہیں۔ جن کورسوں میں داخلے دیے جا رہے ہیں ان میں تین سالہ ڈگری کورسز بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے علاوہ چار چھ ماہی سرٹی فکیٹ پروگرام غذا و تغذیہ، کمیونکیشن، اہلیت اردو بذریعہ ہندی اور اہلیت اردو بذریعہ انگریزی شامل ہیں۔ ڈگری کورس کے لیے شخصی طور پر فارم کی قیمت مع تفصیلی پراسپکٹس 35 روپے ہے۔ یہ فارم "مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی" کے نام حیدر آباد میں قابل ادا 40 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ بھیج کر یونیورسٹی ہیڈکوارٹر سے بذریعہ ڈاک بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سرٹی فکیٹ پروگراموں کے داخلہ فارم مع پراسپکٹس کی قیمت دس روپے (بذریعہ ڈاک 15 روپے) ہے۔

ڈاکٹر محمد ظفر الدین

●☆●☆●